سر سید احمد خان اور مسلمانوں کے علمی رجحانات: تعلیمی فلسفے کا سماجی و تاریخی جائزہ

ڈاکٹر فرحت جبیں ورک

صدر شعبہ ءاردو زبان وادب فاطمہ جناح ویمن یونی ورسٹی، راولپنڈی

ڈاکٹر محمد بلال

صدر شعبہ ءبشریات فاطمہ جناح ویمن یونی ورسٹی، راولپنڈی

ڈاکٹر شافیہ اعظم

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ ءبشریات، فاطمہ جناح ویمن یونی ورسٹی، راولپنڈی

Abstract:

Sir Syed Ahmed Khan (1858-1898) was a prominent figure of 19the century who played a colossal role during the intellectual crisis of the South Asian Muslims in India. His pragmatic vision as a philosopher and reformer in ameliorating the Muslims while promoting modern technical, scientific and progressive education with an unprejudiced temperament was a revolutionary phase to meet challenges posed by the British colonists after the First War of Independence in 1957. Sir Syed believed that educational backwardness and resistance to modern knowledge are the prime reasons for the abysmal conditions of Indian Muslims. While employing Pierre Bourdieu's theoretical framework of cultural, social and economic capital, the current research aims at exploring the historical legacy and influence of Sir Syed's thought in reforming the ontological structure of Muslim educational propensities during the socio-political decline in the subcontinent. It further explores the relevance of educational philosophy proposed by Sir Syed Ahmed Khan while exploring the contemporary challenges of the contemporary educational

structure in Pakistan. The paper concludes that it Pakistan still faces the quandary of an imbalanced educational milieu and thus it is imperative to engender a cogent educational culture aiming to encourage scientific knowledge vis-a-vis arts, humanities, and social sciences to create a progressive and humanistic society.

سر سید احمد خان کی تعلیمی فکر کو سمجھنے کے لیے مشہور فرانسیسی ماہرِ بشریات اور فلسفی پیرے بُرڈیو(Pierre Bourdieu)کا سرمائے کا نظریہ(Theory of Capital)بنیادی تجزیاتی اساس مہیا کرتا ہے۔وہ یہ اہم بحث کرتے ہیں کہ تعلیمی نظام میں کچھ بچے باقی بچوں کی نسبت زیادہ کامیاب کیوں ہوئے ہیں؟اور وہ کونسے محرکات ہیں جو ان کو سماجی زندگی میں نسبتاً زیادہ کامیابی فراہم کرتے ہیں؟اس ضمن میں برڈیو تین طرح کے سرمایوں کو بیان کرتے ہیں جو طالبِ علموں کی تفریق اور ان کی کامیابی وناکامی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ان میں اوّلین ثقافتی سرمایہ (Cultural Capital)،دوم سماجی سرمایہ(Social Capital)اور سوم اقتصادی سرمایہ (Economic Capital) شامل ہیں۔ثقافتی سرمایہ طالبِ علموں کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہ فرد کو وہ اثاثہ جات مہیا کرتا ہے جو اسے سماجی نقل و حرکت(Social Mobility)اور سماجی حیثیت(Social Status)حاصل کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔اِن اثاثہ جات میں تعلیم سب سے اوّلین ہے۔برڈیو ثقافتی سرمائے کی تین صورتیں بیان کرتے ہیں۔ مجسم (Embodied)جس میں مختلف طرح کی مہارتیں (Skills)، ترجیحات (Preferences) اور سماجی آداب (Mannerism) سرِ فہرست ہیں۔دوسری صورت مادیاتی(Objectified)ہے جس کی مثال میں مشین، آلات، کتابیں، ثقافتی سامان اور نوادرات وغیرہ شامل ہیں۔جبکہ تیسری اہم صورت ادارہ جاتی (Institutionalize)ہے جس کی بڑی مثال تعلیمی اسناد(Credentials)ہیں۔

ان میں سے کسی ایک یا تینوں سرمایوں کا حصول نہ صرف بچوں کو اِس قابل بناتا ہے کہ وہ مسابقت کی دوڑ میں آگے نکل جائیں بلکہ ان کو مزید دو سرمائے بھی فراہم کرتا ہے جس کو برڈیو سماجی اور اقتصادی سرمائے سے تعمیر کرتے ہیں۔سماجی سرمائے سے مراد سماجی تعلقات کا حصول ہے جو معاشرے میں بڑھوتری (Progress) کے ذرائع مہیا کرتا ہے۔جبکہ اقتصادی سرمائے سے مراد وہ تمام مادی اثاثہ جات ہیں جن کو پیسوں(Money)میں تبدیلی کیا جاسکتا ہے۔

سرسید کا فنی تعلیم کا نظریہ، برڈیو کے الفاظ میں طلبہ وطالبات کو ان مہارتوں سے روشناس کراتا ہے جو نہ صرف ان کو ثقافتی سرمایہ مہیا کرتے ہیں بلکہ اس فنی تعلیم کے ذریعے وہ سماجی اور اقتصادی سرمائے کا حصول بھی اُن طالبِ علموں سے بہتر طور پر کرسکتے ہیں جو فنی تعلیم سے بہرہ ور نہیں ہیں۔

سر سید کے نظریہ میں فنی تعلیم کو بنیادی مقصدیت حاصل ہے جو طالبِ علم کے سماجی و اقتصادی مستقبل کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ برڈیو اس کو درج ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں

By conferring institutional recognition on the cultural capital possessed by any given agent , the academic qualification also makes it possible to compare qualification holders and even exchange them (by substituting one another).Furthermore, it makes it possible to establish conversion rates between cultural capital and economic capital by guaranteeing the monetary value of a given academic capital(1)

یعنی وہ افراد جن کے پاس ایسی مہارتیں موجود ہوتی ہیں۔ اِس علم کی بنیاد پر وہ سماجی و اقتصادی مسابقت میں آگے نکل جاتے ہیں۔ سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید کی تکمیل کے علاوہ دو اہم تواریخ کے مجموعہ جات "آئینِ اکبری از ابو الفضل"، تاریخ فیروز شاہی از ضیا الدین برنی کی تصحیح کا کام سر انجام دے کر ثقافتی سرمایہ کے لئے کاوش و جستجو کرتے رہے تو دوسری طرف سماج کے اجتماعی شعور کو بیدار کرنے کے لئے مشرقی جبلت و ماحول کو موافق اور ناموافق کی تخصیص سے نکال کر کُل میں ڈھالنا چاہتے تھے۔ سر سید اس جدلیاتی عمل یعنی ایک ایسے سماج کے خواہاں تھے کہ جہاں مشرقی فرد کی موجودگی کی بحالی ممکن ہو۔ اِس سماجی شعور کے لئے وہ منطقی انداز میں کلچ کو ایک وسیع انسانی عمل قرار دیتے رہے۔ جہاں ثقافتی سرمائے کی صورت عبادت، فنونِ لطیفہ اور اسطور سازی سب موجود ہے۔ جب کہ مشرقی سماجی زندگی پر مغربی سماج کا غالب خوف جو کہ ایک شگاف کی صورت بڑھتا جارہا تھا اور نتیجتاً ہندوستانی سماج میں تین طرح کے دماغی گروہ پنپے، ایک وہ جو مغربی علوم کو مغرب کی غلامی متصور کئے ہوئے تھے اور ایسے نظام سے نالاں تھے جب کہ دوسرے وہ کہ جو ایسے شگاف کو مکمل طور پر پُر کر کے عالم گیر مثبت سوچ کو تعلیمی و مادی نظام کا حصہ بنانے کے متمنی تھے۔ جب کہ تیسرا ایسا بھی گروہ تھا کہ جو گزر گاہ کے دونوں جانب حیران و متجسس موجود تھا۔ پہلی اور تیسری قسم کے گروہوں سے سماجی ترقی کے راستے میں ایک Blockade پیدا ہو گیا تھا جسے پُر کرنے کے لئے مناسب راستہ درکار تھا۔ ایک ایسا پیرائیہ کہ جو اقتصادی سرمایہ کی بڑھوتی میں بھی معاون ہو۔ ایسے میں سر سید احمد خاں کی سعی علومِ مفیدہ کے لئے راہ ہموار کرنا تھا۔ رہبر تعلیم سر سید احمد خاں نے اُس دور سراسیمگی میں ایسی تعلیم کی سعی کی کہ جو عالمی صنعت و تجارت کے لئے مشرق و مغرب کے مابین ربط و تعامل کی داعی ہو۔ بلاشبہ یہ تصورِ تعلیم سر سید کو آج کے دور میں بھی جدید

تر ماہرِ تعلیم کے طور پر پیش کرتا ہے۔اپنی اسی دور اندیشی کے باعث سر سید جسمانی و ذہنی کشمکش میں مبتلا قوم کو مفاہمت پر آمادہ کرتے رہے۔

بقول ڈاکٹر مولوی عبد الحق

سر سید مرحوم کو ابتدا سے اپنے مُلک کے علمی اور تعلیمی مسائل سے گہرا لگاؤ تھا اور جہاں کہیں وہ رہے انھوں نے اشاعتِ تعلیم میں مقدور بھر کوشش کی اور خود بھی اپنی تالیف و تصنیف کا سلسلہ جاری رکھا۔اس سے مُلک کو بہت فائدہ پہنچا اور خیالات میں مغربی تعلیم کی طرف سے بہت کچھ تغیر پیدا ہوا۔۔۔اِسی شوق اور انہاک کا نتیجہ تھا کہ سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم ہوا۔(2)

سر سید کی روشن خیالی، عقلیت و اعتدال پسندی اور مفاہمتی طرزِ فکر نے اول اول، مدرسہ غازی پور(1864)، سائنٹفک سوسائٹی غازی پور(1863)، محمڈن اینگلو اورینٹل کالج(1875)، علی گڑھ مدرسہ(1875)کی عملی صورت اختیار کی۔ جس کی قلبِ ماہیت نے بعد ازاں ہندوستانی کلچر کے مظاہر ہی بدل ڈال۔ جدید ثقافتی، سماجی و اقتصادی منطقے وجود میں آئے، جس نے محض وقتی کثافتیں ہی نہیں دھوئیں بلکہ آئیندہ کے جدید نظامِ تعلیم کا نقطہء انضمام بھی ثابت ہوا۔اُس وقت یں سر سید کے تعلیمی فلسفے نے سماج کے کوڈز اور کنونشنز بدلنے کی سعی کی۔ وجہ لامتناہی سماجی سلسلے کے انجام کی سعی بھی ہو سکتی ہے مگر سر سید کے ہاں اس تعلیم کے حصول کا مقصد قوم کے وجود اصلاً کی بازیافت کرنا تھا۔

سر سید احمد خاں کی جدلیاتی فکر نہ تو قدیم کا مضحکہ اڑانے پر مُصر تھی اور نہ ہی ہنگامی انداز سے کسی وقتی فائدے کو اپنانے کی تاک میں تھی بلکہ وہ دورہء انگلستان کے بعد عالم گیر صنعتی انقلاب کے تعاقب میں نیا سماجی سُپر اسٹرکچر دیکھ چکے تھے۔مادی جدلیات انسانی سماج و افکار کی ترقی و حرکت کی سائنس وضع کر رہی تھی۔ سر سید سب سے پہلے تعلیم اور پھر فنی تعلیم کی اہمیت کو سرمائے کی جدلیات (The Dialectics Of Capital)کے تناظر میں بھی سائنسی علوم و فنون کے لئے ہنوستانی سماج کو نئے تعلیمی اصول وضع کرنے پر آمادہ کر رہے تھے جو پرانے اندازوں کو بھی ساتھ لے کر چلیں مگر جو ہیئت و عمل کے اعتبار سے جدید ہوں۔اُن کے ایسے ذریعہ تعلیم کی جستجو کے تاریخی و سماجی پس منظر میں 1857 کی جنگِ آزادی تو ہے ہی مگر یہ تخریب، تعمیر کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوئی۔ صنعتی انقلاب، مغرب سے ہوتا، مشرق کے دروازوں پر پوری قوت سے دستک دے چکا تھا۔ نئ انقلابی تفہیم کے لئے سر سید نے بھی تعلیم کے ساتھ مجموعی سماجی رویہ تبدیل کرنے کے لئے اردو زبان و ادب کو بھی ذریعہ بنایا، رسالہ تہذیب الاخلاق اِس کی ایک اہم مثال ہے۔اِسی میں چھپنے والے اظہار و تاثرات نے اداروں کی تشکیل کا کام بھی کیا۔ سائنسی و فنی تعلیم کی داغ بیل ڈالتے ہی اربابِ اقتدار کے مدح سراؤں کی جگہ علمی و ادبی تحقیق کے لئے نئے امکانات کے روشن مینارے تعمیر ہونے لگے۔

سر سید کے تعلیمی فلسفے کی بنیاد کو مغربی صنعتی انقلاب کے ذریعہ ذیل کے اقتباس کے ذریعہ سمجھنا زیادہ فعال ہو گا

انیسویں صدی مغربی یورپ کے لئے برکتوں اور لعنتوں کی صدی تھی۔ صنعتی ترقی نے نئے امکانات سے انسانیت کا دامن بھر دیا تھا۔ صنعتی ترقی نے نئے امکانات سے انسانیت کا دامن بھر دیا تھا۔ پہلی بار انسان ستاروں پر کمندیں ڈالنے کی ہمت کر سکا تھا، نئے براعظم دریافت ہو رہے تھے اور نت نئی آرزوئیں، امیدیں اور حوصلے جنم لے رہے تھے، دیہاتوں اور قصبوں سے لوگ بھاگ بھاگ کر شہروں میں آباد ہو رہے تھے، نئی نو آبادیاں اُبھر رہی تھیں اور اس ہلچل میں پرانی اخلاقیات ہی نہیں پرانے طرزِ زندگی کی بنیادیں متزلزل ہوتی نظر آ رہی تھیں، نئے ضابطہ ءحیات کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی جو انسانی زندگی کو نئی معنویت اور نئی مقصدیت دے سکے اور اسے عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر سکے۔(3)

محولہ بالا ایک ایسا نیا طرزِ زندگی تھا کہ جس نے بہت جلد پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ برصغیر پاک و ہند میں ایسے انقلاب کی دستک پر سر سید احمد خاں نے اثباتی علوم کے افادی نقطہ ء نظر کے حصول و فروغ پر زور دیا کیونکہ

سر سید احمد خان ایسی بے مقصد تعلیم کے قائل نہ تھے جن سے معاشرے میں کوئی جوہری تبدیلی برپا نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فنی تعلیم پر خصوصی توجہ کے قائل ہوئے۔ اُن کا تعلیم کے لئے زاویہ ء فکر محض نظری مباحث پر ہی اکتفا نہ کرتے ہوئے وہ علم کے عملی اطلاق پر زور دیتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے ذریعے زمان و مکاں اور فطرت کی قوتوں کی تسخیر چاہتے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ ہمہ جہت تعلیم کے خوگر تھے جو عصری تقاضوں، مغربی علوم و فنون کی اہمیت` اور اجتماعی فکر کا رحجان پیدا کرے۔ وہ خود بھی نئے تصورات کی تحصیل میں ہمہ وقت مشغول رہتے کہ ان کے بغیر ترقی اور رفعت کے معرکے میں کامیابی ممکن نہ تھی۔ ایک مصلح اور خیر خواہ کے طور پر ان کی دلچسپیوں کی کوئی نہایت ہی نہ تھی۔ ان کی مذہبی خدمات، سیاسی فرمودات اور تعلیمی کارناموں کا احاطہ ایک کتاب تو کیا کئی جلدوں میں بھی ممکن نہیں اس لئے سر دست ان کے ایسے خیالات، فرمودات اور اقدامات پر الگ سے توجہ مرکوز کرنا ہے جو اس زمانے کے حالات کے مطابق علوم و فنون میں سے خاص طور پر فنون کی ترقی کے بارے میں ہیں۔

دراصل سرسید مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اقتصادی میدان میں آگے بڑھتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے اور ہر وقت ان کی بہتری کی تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔ مسلمانوں کو زندگی میں کامیابی کے ذرائع اور گر سکھانے پر انہوں نے اپنے جن رفقاء کو لگار کھا تھا ان میں الطاف حسین حالی نمایاں تھے جنھوں نے کامیابی کے لیے تین شرطیں محنت، علم اور ہنر لازمی قرار دی تھیں۔ انہوں نے دلیل سے سمجھایا کہ پیمائش کرنے کے لئے پیمائش کے اصول جاننا کافی نہیں، خود اپنے ہاتھ سے پیمائش کرنا بھی ضروری ہے اور پیمائش اپنے ہاتھ سے وہی کر سکے گا جو پیمائش میں مشّاق بھی ہو۔ جو کوئی پیمائش کا علم اور ہنر جس قدر زیادہ جانتا ہو گا اس کی کامیابی بھی اسی قدر زیادہ ہو گی۔(4) اسی لئے سرسید احمد خان نے محمڈن ایجوکیشنل کانگریس قائم کی تو اس کے پہلے اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۸۸۶ء کا پہلا مقصد "مسلمانوں میں یورپین سائنس ولٹریچر کی اشاعت...... کی کوشش" طے کیا۔(5)

اس سے بہت پہلے وہ اپریل ۱۸۶۹ء میں لندن گئے تھے جس کا بنیادی محرک ان کی یہ خواہش تھی کہ ہندوستانی اور خاص طور پر مسلمان یہ سیکھیں کہ کارخانوں، کاشتکاری اور شفاخانوں سے کس طرح زیادہ سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔"کارخانہ داری، کاشتکاری اور شفاخانوں کی کارگزاری ایسے فنون کے زمرے میں آتی ہے جن سے معاشرے کے ہر فرد کو واسطہ پڑتا ہے۔ انگلستان میں قیام کے دوران انہوں نے انجینئرنگ کے عجائبات، جہازوں کی تیاری، توپوں کا ڈھلنا۔ انجینئروں اور عالموں کی سوسائٹیاں، عام کاریگروں اور اہل حرفہ کے کام اور تعلیمی ترقیات کو دیکھا۔"(6)

سرسید نے ۱۳جولائی ۱۸۶۹ء کو سمٹونین سوسائٹی آف سول انجینئرز کے اجلاس میں شرکت کی جس میں انجینئرنگ میں ہونے والی ترقی کا ذکر ہوا اور سرسید نے اپنی تقریر میں فن انجینئری کے نتائج جیسے ریل، بڑے بڑے دریاؤں کے پل، نہریں اور بڑے بڑے پہاڑی چھتوں کا ذکر کیا جس سے صنعت و حرفت میں اہل یورپ کی ترقی پر ان کی حیرانی جھلکتی تھی۔ وہ رستے میں دریائے نیل کا پل دیکھ آئے تھے اور ایک فرانسیسی انجینئر ڈی لسپس سے بھی مل چکے تھے جس نے نہر سویز نکالی تھی۔ سرسید نے اسے اپنے فن میں یکتائے دہر وبے مثل وبے نظیر کہا۔ سرسید نے یورپ کا سفر نوجوانوں کے لئے کارآمد قرار دیا جو "علوم وفنونِ جدیدہ کی تربیت چاہتے ہیں اور یورپ کی زبان سے واقف ہیں۔"(7) محمڈن ایجوکیشن کانگریس جسے بعد میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا نام دیا گیا، علی گڑھ تحریک کا ایک فعال آلہ اور جدید علوم کے فروغ کا ذریعہ تھی۔ اسی کے پلیٹ فارم سے جدید علوم اور صنعتی فنون پر یورپی لٹریچر کی اردو میں ترویج و اشاعت کا کام شروع ہوا۔ قوم کی بھلائی اور ترقی میں سرسید کے اخلاص کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۸۶۹ء میں سفر

لندن سے واپسی پر وہ مختلف فنون اور جدید علوم کی کتب اپنے ہمراہ لائے اور پھر ان کے اردو میں تراجم کی سبیلیں نکالنے کے لئے سرگرم ہو گئے۔

سرسید اس بات کا بخوبی ادراک حاصل رکھتے تھے کہ صنعتی فنون کی بنیاد سائنس پر ہوتی ہے اور بعض صنعتیں ترقی کر کے خود سائنس کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں جن میں انجینئرنگ بھی شامل ہے۔ اسی سوچ کے ساتھ سرسید نے ۹ جنوری ۱۸۶۴ء کو غازی پور کے مقام پر سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی تھی جس کا مقصد غیر ملکی زبانوں سے علوم و فنون کی کتب کا ترجمہ تھا۔

سرسید اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ علومِ جدیدہ کا حسول تبھی ممکن ہے کہ جب مغربی علوم کی کتب مقامی / دیسی زبان میں ترجمہ نہ کر لی جائیں۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، سائنٹفک سوسائٹی کی فعالیت کو یوں بیان کرتے ہیں کہ

جو (یعنی سائنٹفک سوسائٹ) اس غرض سے قائم کی گئی تھی کہ لٹریری اور علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرا کے مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہلِ وطن میں پیدا کیا جائے۔ علمی مضامین پر لیکچر دیئے جائیں، رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر اور گورنمنٹ کے اصول حکمرانی رعایا پر ایک ایسے اخبار کے ذرعے سے ظاہر کئے جائیں جو اردو انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کئے جائیں اور اس طرح قومی مغائرت اور مذہبی تعصبات اور جو جھجک ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے اس کو آہستہ آہستہ کم کیا جائے۔

سرسید کو اس سوسائٹی کی بقاء کی بے حد فکر رہی۔ انہیں لندن میں بھی یہ دھڑکا لگا رہا کہ "میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن، سائنٹفک سوسائٹی کی بڑی مخالفت کریں گے اور کوئی درجہ سعی و کوشش کا، واسطے شکست دینے سائنٹیفک سوسائٹی کے، باقی نہ رکھیں گے"۔(8) اس لئے انہوں نے نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خان کو بذریعہ خط سوسائٹی سنبھالنے کی ہدایت کی۔ سرسید نے ۱۸۸۱ء میں بھی اسی سوسائٹی کو مسٹر کمیسن ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن کی دست برد سے بچانے کی کوشش بھی کی جو ان کے ذاتی مخالف تھے۔(9) اور مخالفت کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ سرسید کی کوششوں سے مسلمان اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہونے کے قابل ہونے لگے تھے۔ علی گڑھ تحریک اور ایجوکیشنل کانفرنس کی مسلسل کوششوں سے اس زمانے میں بہت سے شہروں میں اسلامیہ ہائی سکول قائم ہوئے جن میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ انجینئرنگ، ڈاکٹری اور ٹیکنیکل تعلیم پر زور دیا جاتا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں میں یہ شعور پیدا کیا کہ ملک کے انسانی وسائل اس کی اصل طاقت ہوتے ہیں اور اس کا منبع صناع اور ہنر ور لوگ ہوتے ہیں جو اپنی روزی اپنے ہاتھ سے کماتے ہیں، صنعت و حرفت کی ترقی انہی کی مرہون منت ہوتی ہے اور صنعت و حرفت سے تجارتی سرگرمیوں کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ سرسید اور

ان کے رفقاء کو ادراک حاصل تھا کہ استعماری طاقتوں نے دوسرے ملکوں پر قبضہ تجارتی کمپنیوں کے ذریعے حاصل کیا ہے۔ مشرق میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور مغرب میں ہڈسن بے کمپنی اس کی نمایاں مثالیں تھیں۔ اسی خیال سے جب ایجوکیشنل کانگریس کو کانفرنس کا نام دیا گیا تو اسی اجلاس میں جو دسمبر ۱۸۹۰ء منعقد ہوا، ٹیکنیکل ایجوکیشن کو معمولی تعلیم سے علیحدہ رکھنے کی قرارداد بھی پاس ہوئی جس پر سرسید نے خاص طور پر اطمینان کا اظہار کیا۔(10)اسی کے تسلسل میں دیسی فنون پر کتب علمیہ کی تدوین پر کانفرنس کے ساتویں اجلاس منعقدہ دہلی دسمبر ۱۸۹۲ میں قرارداد منظور کی گئی۔(11) مقصد ٹیکنیکل تعلیم کے ذریعے لوگوں کو اپنا معاش آپ پیدا کرنے کے مواقع فراہم کرنا تھا تا کہ وہ قعرِ مذلّت سے اپنے آپ باہر نکل سکیں۔ سرسید کا مخمصہ یہ تھا کہ ”ہندوستانی یہ جانتے ہیں کہ انگریز جہازوں میں روپیالاد لاد کر ولایت کو لے جاتے ہیں، یہ خیال کیا ہے؟ ایک اصولِ نظام مدن ہے۔“(12)۔

ہندوستاں میں دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی

کافر فرنگیوں نے بتدبیر کھینچ لی(مصحفی)(13)

آگے چل کر وہ کہہ اٹھتے ہیں کہ ”اگر ہماری قوم علوم و فنون سے واقف ہو جائے تو ان کے لئے بھی ہندوستان ہی میں اس قدر دولت اور دولت کے خزانے موجود ہیں کہ پشتوں تک بھی ان کا ختم ہو جانا ممکن نہیں مگر ہم اپنی بے علمی سے ان سے فائدہ نہیں اٹھاسکتے۔“(14) سرسید نے اسی رو میں کاشتکاری میں استعمال ہونے والی کلوں کا ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے زیرِ کاشت رقبے میں اضافہ ہو گیا ہے کہ انسانی ہاتھ سے ان کی کاشت ممکن نہیں رہی اور مشکل یہ ہے کہ وہ کلیں انگریز تو چلا لیتے ہیں لیکن ہندوستانی چلاتے ہیں تو خراب ہو جاتی ہیں اور ان سے زیادہ پیداوار کا فائدہ بھی انگریز اٹھا رہے ہیں۔

تسمہ تسمہ کر دیا بس کاٹ کر عاشق کی کھال

وہ فرنگی زادِ کلکتہ جو سیکھا ناپنا(15)

(بہادر شاہ ظفر)

یوں تو سرسید احمد خان خود بھی بہت باشعور انسان تھے۔ وہ ہر وقت غور و فکر میں مبتلا رہا کرتے۔ انہیں خود بھی زمانے کی رفتار کا احساس تھا۔ عظیم ذہن کی سوچ بھی عظیم ہوتی ہے تاہم سرسیّد سے بیس سال بڑے مرزا اسد اللہ خان غالب نے ۱۸۵۷ء میں آئینِ اکبری کی نو مرتب شدہ اشاعت پر ان کی فرمائش پر جو فارسی منظوم تقریظ لکھی اسے سرسیّد کی فکری اور عملی کایا کلپ کا بڑا سبب قرار دیا جاتا ہے۔ اس تقریظ میں ماضی پرستی کو کارِ عبث قرار دے کر غالب نے سرسید کو ہدایت کی کہ ”آنکھیں کھول کر اس دیر کہن میں اہل انگلستان کو

دیکھیں،"ان کے شیوہ و اندازِ نظر پر نظر ڈالیں۔ انہوں نے کیسے آئین تخلیق کئے۔ ان ہنر مندوں نے ہنر سے ترقی پائی۔ آگ جسے لوگ پتھر سے نکالتے ہیں۔ یہ اہل ہنر کس طرح تنکے سے پیدا کر لیتے ہیں ان لوگوں نے پانی پر کیا افسوں پڑھ دیا ہے کہ دھواں پانی میں کشتی کھینچتا ہے اور بھاپ سمندر میں کشتی اور روئے زمین پر پہیہ چلاتی ہے، بھاپ پہیے کے دھرے کو گھماتی ہے...... یہ لوگ مضراب کے بغیر ساز سے نغمے پیدا کرتے ہیں اور حرف کو طائر کی مانند قوتِ پرواز بخشتے ہیں، دو گھڑی میں سو کوس سے پیغام لے آتے ہیں۔(16) یعنی غالب نے دیا سلائی، بے تار برقی، دخانی جہاز اور بھاپ سے چلنے والی ریل کی طرف سرسید کی توجہ دلائی اور یہی ایجادات بہت سی دوسری صناعیوں کے ساتھ سرسید نے بذاتِ خود یورپ میں دیکھیں اور ان کے ذریعے دنیا پر یورپ کی بالا دستی کا راز سمجھا۔ ۲۹ دسمبر ۱۸۹۰ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے پانچویں سالانہ اجلاس بمقام الہٰ آباد میں سرسید نے ٹیکنیکل تعلیم کی تعریف اسکاٹ رسل سے یوں مستعار لی کہ "یہ امر ضروری ہے کہ ہر ایک شخص اپنے خاص پیشہ تجارت یا حرفے میں اس کے اصولوں کو بخوبی سمجھے۔ اس کے خاص آلات کو زیادہ تر عمدگی سے کام میں لا سکے اور اپنی زندگی کے مقصد کو زیادہ تر جلد اور کفایت کے ساتھ پورا کر سکے خواہ وہ تجارت ہو یا چیزوں کے بنانے کے کارخانے یا تعمیرات یا جہاز رانی۔"(17) انہی دنوں میں حالی نے سرسید کی ہم زبانی میں کہا تھا کہ ع

گئے وہ دن کہ لاکھوں بے ہنریاں عیش کرتے تھے(18)

جن دنوں کی یہ بات ہے اس زمانے میں تکنیکی علوم انہی شعبوں پر محیط تھے۔ بجلی شاید کلکتہ میں آچکی ہو باقی ہندوستان بجلی سے واقف نہ تھا۔ ٹیکنیکل تعلیم کے بارے میں اس دور کے معروضی حالات کے پیش نظر سرسید کے کچھ تحفظات بھی تھے جن کا ذکر اس اہم تقریر میں ہوا ہے۔ ان کی ایک الجھن یہ تھی کہ ہندوستان میں اتنے کارخانے موجود نہیں جن میں تکنیکی تعلیم پانے والوں کی کھپت ممکن ہو سکے اور مزید یہ کہ نئے کارخانے لگانے کے لیے مقامی سطح پر سرمایہ موجود نہیں۔ ایک الجھن کا ذکر سرسید نے مصلحتاً نہیں کیا ہو گا کہ استعماری طاقتیں خام مال تو نو آبادیات سے حاصل کیا کرتی ہیں اور تیار مال زیادہ قیمت پر انہی نو آبادیات میں بیچ کر منافع خوری کیا کرتی ہیں۔ سرسید کا دوسرا خوف ادب اور آرٹس کے مقابل ٹیکنیکل تعلیم کے فروغ سے انسانی اقدار کے زوال کا بھی تھا اس لیے انہوں نے اس شرط پر ٹیکنیکل تعلیم کے فروغ کی حامی بخوشی بھری کہ اسے ادبی تعلیم سے الگ رکھا جائے گا۔(19) لیکن دوسری طرف ادب اور خاص طور پر شاعری بھی تکنیکی تعلیم کی ترغیب دے رہی تھی اور اس پیغام پر مبنی نظمیں سرسید کی موجودگی میں ان کی اجازت سے ہی ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں پڑھی جاتی تھیں۔ ایسی نظمیں کہنے والوں میں سرسید کے نامور رفقاء الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی،

خوشی محمد ناظر اور ڈپٹی نذیر احمد سمیت بہت سے دوسرے نامور شعراء بھی شامل تھے ان کی نظموں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں میں نئے فنون کی لگن کس قدر تھی۔

ضرورت علم و دانش کی ہے ہر فن اور صناعت میں

نہ چل سکتی ہے اب بے علم نجّاری نہ معماری

O

کوئی پیشہ نہیں اب معتبر بے تربیت ہر گز

نہ فصّادی، نہ جرّاحی، نہ کحّالی، نہ عطّاری

O

مہندس چاہیے مزدور اب اور راج اقلیدس(20)

(الطاف حسین حالی)

یہی نہیں بلکہ حالی نے تو حیوانات کی دیکھ بھال کے لئے علمِ بیطاری کی تحصیل کو بھی لازمی قرار دیا۔(21)اس نظم میں حالی نے اپنے ان ارادوں اور آرزوؤں کو سرسید کے منصوبوں کی تائید کہا ہے۔ ان نظموں میں ذریعہ معاش اور مزدوری کو لازم ملزوم کہا جاتا رہا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے سرسید احمد خان کے مرثیے میں سرسید احمد خان ہی کی تلقین کا ذکر کیا ہے۔

ہنر کو کہتے ہیں اور ٹھیک کہتے ہیں کہ دولت ہے

کہ دولت بھی تو دنیا میں ہنر ہی کی بدولت ہے(22)

ایجادات کے صنعت و حرفت پر اطلاق کی بات کو ہم نیا سمجھتے ہیں مگر ہمارے ہاں بھی یہ بات مغرب کی طرح پرانی ہے کہ اس پر سب سے پہلے سرسید ہی نے توجہ دلائی تھی۔ قوم نے ان کی بات سنی مگر وقت گزرنے پر اور خاص طور پر آزادی حاصل ہونے کے بعد بھی ہم اسے اپنے تعلیمی و تحقیقی نظام کا لازمی جزو نہیں بنا سکے۔ جھگڑا ہمیش یہی رہا کہ مشرق کی منطق، مغربی منطق سے کہیں میل نہیں کھاتی جب کہ فی زمانہ حقائق یہ کہتے ہیں کہ ترقی کے عوامل از فاصلہ کے قبول کرنے میں کوئی تعامل نہیں ہونا چاہئے۔

سرسیّد احمد خاں کی ایماء پر اس دور میں ہندوستان کے طول و عرض میں مسلمانوں نے اپنے آپ کو سودمند اور آزاد پیشوں میں منہمک کیا۔ تجارت، زراعت، صنعت، حرفت کی طرف توجہ بڑھنے لگی اور مسلمان ترقی کے ان ذرائع و منابع کو محرکِ اول جان کر کہنہ

تحقیقات و اسباب میں مگن ہونے لگے۔ سر سید حرکت و عمل کے اُس ابتدائی نقطہ پر میسر رہے کہ جس سے حرکت و عمل کی نت نئی سمتیں ظاہر ہوتی رہیں۔

حوالہ جات

1- Pierre Bourdieu 1986.The forms of capital in john,P.248

2۔ مولوی عبد الحق،ڈاکٹر، سر سید احمد خاں حالات و افکار، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی،1998، ص۔79

3۔ محمد حسن، مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ، بک ٹائم، کراچی،2018، ص159

4۔ الطاف حسین حالی: مقالات حالی، حصہ اوّل، انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان، کراچی، طبع چہارم،۱۹۵۷ء، ص۔۱۰۸،۱۰۷۔

5۔ سید الطاف علی بریلوی و محمد ایوب قادری (مرتبین): علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی، ۱۹۷۰ء، ص۔۱۸۔

6۔ سر سید احمد خان: مسافرانِ لندن، مجلس ترقیٔ ادب، لاہور ۱۹۶۱ء، ص۔۱۷۱۔

7۔ سر سیدؒ احمد خان: مسافرانِ لندن، مذکور، ص۔۱۰۶۔

8۔ سر سید احمد خان: مکتوب بنام حکیم غلام نجف خان، مشمولہ مکتوباتِ سر سیّد، مجلس ترقیٔ ادب لاہور۔۱۹۵۹ء، ص۔۶۵۔

9۔ مولوی عبد الحق،ڈاکٹر، سر سید احمد خاں حالات و افکار، ص110

10۔ سر سید احمد خان: مکتوب بنام نواب محسن الملک، مشمولہ مکتوباتِ سر سیّد، مذکور، ص۔۴۰۔

11۔ سر سیّد احمد خان: مکتوب بنام مولوی سید ممتاز علی، مشمولہ مکتوباتِ سر سید، مذکور ص۔۳۷۶۔

12۔ سید الطاف علی بریلوی و محمد ایوب قادری (مرتبین): علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں مذکور، ص۔۷۹۔

13۔ ایضاً: ص۔۹۳۔

14۔ سر سیّد احمد خان: خطباتِ سر سیّد، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقیٔ ادب، لاہور ۲۰۰۹ء،۔ ص۲۱۔

15۔ ایضاً: ص۔۱۶۴۔

16۔ ایضاً: ص۔۱۶۴۔

17۔ (ڈاکٹر) عباس برمانی: غالب کے زمانے کی دلّی، سنگِ میل، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص۔۱۷۳۔

18۔ سر سید احمد خان: خطباتِ سر سیّد مذکور، ص۔۵۰۵۔

19۔ الطاف حسین حالی: مشمولہ علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں مذکور، ص۔۴۴

20 سر سید احمد خان: خطباتِ سر سیّد مذکور، ص۔۵۰۵۔

21 الطاف حسین حالی: مشمولہ علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں مذکور، ص۔۴۴۔۴۵۔

22۔ ڈپٹی نذیر احمد: ایضاً، ص۔۱۷۱۔

References

1- Pierre Bourdieu 1986.The forms of capital in john
G. Richardson (Ed.), Handbook of Theory and Research in the Sociology of Education, Greenwood Press, New York (1986).pp.241-258

2- Pierre Bourdieu, Jean-Claude Passeron (1990) Reproduction in Education, Society and Culture. Sage, Landon.

3- Pierre Bourdieu (1984) Distinction. A Social Critique of the Judgement of Taste Harvard University Press, Cambridge.

4-Howard, V.F., McLaughlin, T.F., & Vacha, E. F. (2004). Educational capital: A proposed model and its relationship to academic and social behavior of students at risk. Journal of Behavioral Education, 6(2), 135-152.